



Article

The Mythological Discussions of Modern Poems

نظم جدید کے اساطیری مباحث

Farooq Baig *¹, Sajid Ali²¹ Lecturer, Department of Urdu, Riphah International University, Faisalabad² PhD. Scholar, Riphah International University, Faisalabad*Correspondence: farooqbaig@hotmail.com¹ محمد فاروق بیگ، ² ساجد علی¹ لیکچرار، شعبہ اردو، رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی، فیصل آباد، ² پی ایچ ڈی اسکالر، رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی، فیصل آباد

eISSN: 2073-3674
 pISSN: 1991-7813
 Received:00-00-0000
 Accepted:00-00-0000
 Online:00-00-0000



Copyright: © 2023
 by the authors.
 This is an open-
 access article
 distributed under the
 terms and conditions
 of the Creative
 Common Attribution
 (CC BY) license

Abstract: The topic of my article is " The mythological debate of modern poem".In this article, great effort is made to introduce the myths of ancient civilization besides making the meaning of myths obvious. Myths are civilization and culture with which Urdu poem established its relation in its initial creative period, and age after age, has presented the individual's contemporary problems in the light of cultural perspectives. Modern poems have been explained through mythological symbols, mechanical life, rapidly changing trends, mourning on the violation of religious, moral, social, and political values, and the fears about the extinction of individual personal, and identity. Modern poem hare means only that poem which Tasddaq Hussain Khalid, Noon meem Rashid, and Meeraji pioneered. The writer has presented the study of the poems of Meeraji's Contemporaries and the poets who afterward developed the modern poem.

Keywords: Mythology, Modern Poem, Majeed Amjad, NM Rashid, Akhtar Sherani

بعض ناقدین اساطیر کو خرافات کہہ کر رد بھی کرتے رہے ہیں۔ لیکن اساطیر کو خرافات اور فضولیات کے زمرے میں نہیں رکھا جاسکتا کیونکہ قبل از تاریخ کے انسان نے اساطیر کے ذریعے اپنی ذات اور ماحول کے اظہار کے ساتھ ماورائی قوتوں کے درمیان تعلق کو بھی دریافت کیا ہے۔ اساطیر اپنے تخلیقی عہد کے انسان کی فلسفیانہ سوچ کی عکاسی کرتے ہیں اور ان کے پس منظر میں فلسفیانہ عناصر کار فرما ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زبان اور ہر عہد کے ادب میں انسان کی نفسیاتی کیفیات کو بیان کرنے کے لیے اساطیر سے معاونت لی جاتی رہی ہے۔ اساطیر اس عہد کی تاریخ، معاشرت، الہیات، سائنس فکشن اور سماجی رویوں کی عکاسی کرتے ہیں جس عہد میں ان کی تخلیق ہوئی تھی۔ مختصر آئیہ کہا جاسکتا ہے کہ اساطیر وہ سب کچھ ہے جو اس کے تخلیقی عہد کا انسان سوچا کرتا تھا۔ سبط حسن ”ماضی کے مزار“ میں لکھتے ہیں :

اس تک انسان، فطرت، کائنات اور ماورائی قوتوں کے درمیان تعلق کو دریافت کرتے اور ماورائی ہستیوں کو تسخیر کرنے کے لیے تین نقطہ نظر سامنے آچکے ہیں، پہلا مکتب فکر ”جادو“ ہے۔ جس نے فطرت اور ماورائی ہستیوں کو مطیع بنانے کی اولین کوشش کی تھی۔ اصل میں جادو ماورائی قوتوں کی پیداوار ہے جو کائناتی نظام کی اسرار پر پیشکش کرتا ہے۔ جادو گروں اور ساحروں کا خیال تھا کہ اگر وہ مظاہر فطرت کی نقالی کریں گے تو ان میں پوشیدہ ماورائی قوتوں کو اپنے اعمال و افعال سرانجام دینے کے لیے تحریک ملے گی۔

اس مقصد کے لیے جادو گروں نے مختلف رسومات کو فروغ دیا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ جب ان پر یہ واضح ہو گیا کہ ماورائی قوتیں ان کی پیروی نہیں کرتیں بلکہ وہ خود کار نظام کے تحت ایسے افعال سر انجام دیتی ہیں تو انہوں نے ماورائی قوتوں کی خوشنودی

حاصل کرنے کے لیے ان کی مدح و ستائش، قربانی اور مختلف منتروں کو فروغ دیا۔ جس سے ابتدائی مذہب کے نقوش واضح ہونے لگے۔ مذہب انسان، فطرت اور مافوق قوتوں کے درمیان تعلق کو سمجھنے کا دوسرا مکتبہ فکر ہے۔ اس لیے بہت سے جادوئی رسم و رواج مذہبی عقائد میں شامل ہو گئے۔ ”شاخ زریں“ (گولڈن بو) کے مصنف جیمز فریزر کے مطابق:

”سحر قدیم مذہب کی بنیاد تھا۔ جب کسی خدا کے ماننے والا اپنے معبود سے مراد مانگتا تو اس کے لیے اپنی کامیابی کی صورت سوائے اس کے اور کوئی نہ تھی کہ وہ اس خدا کو رام کرے اور یہ صرف ان چند رسموں قربانیوں، دعاؤں اور بھجनों کے ذریعے ممکن تھا جو خود اس کے خدا نے نازل کی تھیں۔“ (۳)

یہ بات واضح رہے کہ یہاں مذہب سے مراد وہ نہیں جو مذہبی علما مراد لیتے ہیں بلکہ مذہب سے مراد وہ رسومات اور جنتز منتر ہیں جن کے ذریعے قبل از تاریخ کا انسان ماورائی قوتوں کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا یا آپ اسے مکتبہ فکر (School of thought) کہہ لیں۔ جادوئی اور مذہبی نقطہ نظر میں یہ مماثلت ہے کہ ماورائی صاحب ارادہ ہیں جن کے ارادے کو مختلف رسومات کی ادائیگی ان کی تعریف و توصیف، ریاضت، تپسیا، چلوں اور منتروں کے ذریعے بدلا جاسکتا ہے۔ مذہب اور جادو میں قریبی تعلق ہونے کی وجہ سے بہت سی جادوئی کہانیوں کو مذہبی عقائد میں جگہ مل گئی اور وہ ہمیشہ کے لیے مذہب کے دامن میں محفوظ ہو گئیں۔ مذہب نے جادوئی اساطیر کو محفوظ کرنے کے ساتھ کچھ اساطیر خود بھی تخلیق کیے ہیں۔ مذہب کے بعد کائنات کے رازوں کا پردہ چاک کرنے کے لیے سائنسی نقطہ نظر سامنے آیا۔ سائنسی تصورات اور نظریات نے مذہب کی ساخت کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا اور مذہب کے بعد سے عقائد کو چیلنج کر دیا۔ جن مافوق الفطرت اور خیالی چیزوں کا ذکر اساطیر اور مذہب میں ملتا ہے ان کو سائنس نے عملی شکل دے دی۔ اس طرح ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ سائنس کی بنیادیں اساطیر پر قائم ہیں۔

اساطیر اور سائنسی تصورات، نظریات اور سائنسی ماڈلوں میں کئی حوالوں سے مماثلت پائی جاتی ہے۔ جس کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ آنے والی صدیوں میں کائنات کے نظام کے مطالعہ کے لیے جب کوئی نیا مکتبہ فکر وجود میں آئے گا تو سائنسی تصورات و نظریات اساطیری روپ اختیار کر لیں گے۔

A Dictionary of Mythology کے مصنف فرنانڈ کاٹھ کا خیال ہے کہ سائنسی ایجادات میں اساطیری روپ دھارنے کے امکانات موجود ہیں۔ (۴) ڈاکٹر فرمان فتح پوری ”اردو کا افسانوی ادب“ میں کلیم الدین احمد کا حوالہ دیتے ہوئے رقم کرتے ہیں:

”ممکن ہے مستقبل بعید کے انسان کے لیے آج کی بعض ایجادیں مثلاً ریڈیو، ٹیلی فون، تار لاسکی، ٹیلی ویژن اور ہوائی جہاز اس قسم کی دوسری چیزیں مافوق الفطرت کے کارنامے خیال کیے جائیں۔“ (۵)

اگر آج بھی بعض سائنسی تصورات کا مطالعہ غور سے کیا جائے تو ان میں بہت سی باتیں اساطیری نوعیت کی معلوم ہوتی ہیں۔ اس حوالے سے بگ بینک کی تھیوری کو مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے جو تخلیق کائنات کی اسطوری کہانیوں کی تجدید ہے۔ مذکورہ بالا تینوں

مکتب فکر (جادو، مذہب اور سائنس) نے اپنے اپنے انداز میں اسطورہ سازی کی ہے۔ اسطورہ سازی ایک ہمہ گیر عمل ہے جو ہر عہد میں غیر شعوری طور پر جاری ساری رہتا ہے لیکن اس کا احساس اس عہد کے انسان کو نہیں ہوتا جس میں اساطیر تخلیق ہو رہے ہوتے ہیں۔ جوں ہی زندگی نئے عہد میں داخل ہوتی ہے تو سابقہ عہد کی اکثر چیزیں اسطوری معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اگر قدامت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو سمیری تہذیب کے اساطیر کو دیگر تہذیبوں کے اساطیر سے اولیت حاصل ہے۔ سمیری اساطیر کے مطالعہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سمیری معاشرہ انتشار اور بد نظمی کا شکار تھا اور اس معاشرے میں وحدت کا عنصر مفقود تھا۔ سمیریوں کے زوال کے بعد جب اقتدار اہل بابل کو منتقل ہوا تو انھوں نے اپنا تہذیبی جواز پیدا کرنے کے لیے شعوری طور پر اساطیر تخلیق کیے۔ جس سے بابلی تہذیب کے اساطیر میں وحدت کا عنصر نمودار ہوا۔ اب ان کے دیوتا مختلف مسائل کے حل کے لیے مجلس شوریٰ کا انتظام کرتے تھے اور مجلس جو فیصلہ کرتی تھی اس پر عمل کرنا دیوتاؤں کے لیے ضروری ہوتا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل بابل جمہوری نظام حکومت سے واقفیت رکھتے تھے۔ مجلس شوریٰ کے جن دیوتاؤں کو اہمیت حاصل تھی ان میں انو، ان لیل، ان کی، نور، تار، نن، ہورسگ، انانا، گل گامش، نننا اور اتو شامل ہیں۔ قدامت کے اعتبار سے سمیری اور بابلی تہذیب کے بعد مصری تہذیب کا نمبر آتا ہے۔ قدیم مصری ادب مذہبی نوعیت کا ہے۔ انعم نواز ”انتظار حسین کے افسانوں میں اساطیری اور تمثیلاتی عناصر“ میں لکھتی ہیں:

”مصریوں کا اولین سرمایہ ادب مذہبی یا دینی ہے جسے ہر می ادب کا نام دیا گیا ہے۔“ (۶)

مصریوں نے اخلاقی تربیت کے لیے اساطیری کہانیاں تخلیق کی تھیں۔ مصریوں کے اساطیر کی خاص بات یہ ہے کہ وہ مذہبی نوعیت کے حامل ہونے کے باوجود کسی نہ کسی سطح پر مادی حقیقت سے بھی جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ مصری ادب کی اولین کتاب ”پٹا ہوٹپ“ (2500 ق م) کی تحریر ہے۔ اس کا شمار دنیا کی قدیم ترین کتابوں میں ہوتا۔ اس میں مذہبی نوعیت کی کہانیاں بیان ہوئی ہیں جو اسلوب کے لحاظ سے حکایات سلیمان سے بہت زیادہ مماثلت رکھتی ہیں۔ مصریوں کی دوسری قدیم کتاب Book of the Dead (1550 ق م) ہے۔ اس کتاب میں دیوی دیوتاؤں کی عبادت کے طریقے، مرنے کے بعد زندگی اور فیصلے کے دن کا اظہار ملتا ہے۔ ”پٹا ہوٹپ کی تحریر“ اور ”Book of the Dead“ مصری اساطیر کے بنیادی ماخذ ہیں۔ مصریوں کے عقیدے کے مطابق ان کے بادشاہ (فرعون) دیوتاؤں کے اوتار ہیں اور ان کا وجود رعایا کے لیے باعث رحمت ہے۔ مصری اساطیر میں دیوتاؤں اور فرعون کے علاوہ بیل، گائے، سانپ اور عقاب کا بھی ذکر ملتا ہے۔ مصری اساطیر میں کچھ مرکب قسم کے کردار بھی ملتے ہیں۔ جن کی نصف جسم آدمی کا ہے اور نصف کسی جانور کا ہے۔ اس کی مثال ”ابو الہول“ ہے جو ہیبت کا دیوتا ہے۔ مصریوں کے اہم دیوتا ازریس، انفیس، ساتیت، ہوریس، انومیس ہیں۔

قدیم یونانی بہت زیادہ اوہام پرست تھے۔ ان کے ہاں دیوتاؤں کی کثرت تھی۔ ان کے عقیدے کے مطابق دنیا میں کوئی ایسی جگہ نہیں جو دیوی دیوتاؤں سے پاک ہو۔ ان کے نزدیک دیوتاؤں کا اولین مسکن ”اولمپیا“ کا پہاڑ ہے۔ یونانی اساطیر کے اولین ماخذ ہو مرکی

رزمیہ نظمیں ایلید اور اوڈیسی ہیں۔ ان نظموں میں سمندری عفریتوں پر یوں اور جل پر یوں کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ یونانی اساطیر اہل یونان کی ذہنی اختراع کا نتیجہ ہیں لیکن یونانی اساطیری کہانیوں نے مصری اساطیر سے کافی اثرات قبول کیے ہیں۔ یونانی دیوی دیوتا قوت کی علامت ہیں یونانی معاشرے کا کوئی ایسا پہلو نہیں جس کی بنیاد اساطیر پر نہ ہو۔ یونانی اساطیر میں دیوی دیوتاؤں کو پہلی بار انسانوں کے قریب دکھایا گیا ہے۔ ”انسائیکلو پیڈیا ادبیات عالم“ کے مولف یاسر جواد کے مطابق یونانیوں کے نزدیک دیوتا اور انسان میں فرق صرف یہ ہے کہ انسان فانی ہے اور دیوتا فانی۔ (۷)

زنیکس، ڈیمیٹر، ہڈس، پوسی ڈون، ہیرا، اپالو، اتھینا، ڈایونیس، ایرس، انیس انیس یونانی دیوتا ہیں۔ ان دیوتاؤں کے علاوہ کچھ یونانی سورا بھی اسطوری خصائص کے مالک ہیں ان سوراؤں میں پریم، اوڈیس، الیڈا، مینی لاس، ہرکولیس اور ایکلیز قابل ذکر ہیں۔

وادی سندھ کی تہذیب سمیری اور بابلی تہذیب کی ہم عصر تھی۔ اس تہذیب کے اساطیر کا ذکر سمیری اور بابلی ادب میں ملتا ہے۔ وادی سندھ کی تہذیب کا ادب تاحال دریافت نہیں ہوا۔ وادی سندھ کی کھدائی کے دوران جو مہرے ملی ہیں ان پر دیوی، دیوتاؤں، جانوروں، پرندوں اور درختوں کے نقوش کے علاوہ کچھ تحریریں بھی کندہ ہیں لیکن ابھی تک رسم الخط سے ناواقفیت کی وجہ سے ان تحریروں کو پڑھا نہیں جاسکا۔ صرف قیاس کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جن چیزوں کے نقش مہروں پر بنے ہوئے ہیں وہ وادی سندھ کے باشندوں کے نزدیک مقدس تھیں۔ مہروں پر دیوی دیوتاؤں کے جو نقش کندہ کیے گئے ہیں وہ سمیری، بابلی، مصری، اور ہندی دیومالا کے دیوتاؤں سے مماثلت رکھتے ہیں۔ وادی سندھ کی دیومالا میں ایک دیوتا ملتا ہے۔ جس کے متعلق ”سرجان مارشل“ کا خیال ہے کہ وہ دیوتا ہندوؤں کے دیوتا ”شیو“ کے مماثل ہے۔ (۸) جس کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ وادی سندھ کی دیومالا ہندی دیومالا کی جد امجد ہے۔ ہندی دیومالا ہندوستانی دھرتی کی طرح بہت زیادہ پراسرار ہے جو اس دھرتی کے باشندوں کی فلسفیانہ سوچ اور فکر کی عکاسی کرتی ہے۔ ہندی دیومالا میں زندگی کے اسرار اور موز کو فلسفیانہ موٹکافیوں کے ذریعے بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہندی دیومالا کے ماخذ وید اور پران ہیں۔ رامائن اور مہابھارت لوک کتھاؤں کے ماخذ ہونے کی وجہ سے پرانوں میں شمار ہوتی ہیں۔ ہندی دیومالا میں خدائے واحد کا تصور ملتا ہے۔ ڈاکٹر اے جے مالوی اپنی تصنیف ”ویدک ادب اور اردو“ میں ڈاکٹر شکیل الرحمن کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ویدوں میں جو مختلف دیوتا ملتے ہیں اصل میں یہ ایک ہی دیوتا (معبود حقیقی یا روشنی) کے مختلف پہلوؤں کے مظہر ہیں۔ (۹) برہما، وشنو اور شیو ہندی دیومالا کے بنیادی دیوتا ہیں۔ ان دیوتاؤں کے علاوہ ہنومان، رادھا، رام، راون، سکند، سوریا، سوما، شکتی، کام، کرشن اور گنیش قابل ذکر ہیں۔

مذکورہ بالا تہذیبوں کے اساطیر میں تخلیق کائنات کی کہانی اور طوفان عظیم کا قصہ مشترک طور پر ملتا ہے۔ درج بالا تہذیبوں کی اساطیری اور دیومالائی کہانیوں سے اردو زبان و ادب نے عہد بہ عہد مثنوی، داستان، افسانہ اور نظم کی صورت میں استفادہ کیا ہے۔ نظم اور اساطیر کا تعلق بہت قدیم اور فطری نوعیت کا ہے۔ ان کے درمیان کوئی ازلی وابستگی ہے۔ نظم اور اساطیر تخیل کی پیداوار ہونے کے ساتھ اپنی دھرتی، تہذیب اور تاریخ سے جنم لیتے ہیں۔ ان کے پیچھے بہت سے تہذیبی اور ثقافتی عوامل کار فرما ہوتے ہیں۔ دراصل انسان کے رگ

وہی میں ایک فطری آہنگ روزِ ازل سے موجود ہے۔ جس کا اس نے پہلی بار اظہارِ اساطیر کی صورت میں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر عہد اور ہر زبان کی نظم اساطیری عناصر سے پاک مبرا ہے۔ اردو نظم نے بھی اساطیر سے بہت سے استعارے اور علامتیں لی ہیں۔ جن سے اس کے دائرہ کار میں بہت وسعت آئی ہے۔ اساطیری کردار دھرتی کے مجموعی احساسات اور خواہشات کا اظہار کرتے ہیں۔ جب اردو نظم ان کرداروں کو اپناتی ہے تو اس کی تفہیم کے کئی نئے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں اساطیری علامتیں اور موضوعات اردو نظم کی گہرائی اور ہمہ گیریت کا سبب بنتے ہیں۔

اردو نظم نے عہد بہ عہد کئی کروٹیں بدلی ہیں اور ہر بار اس نے نئے رجحانات کو متعارف کروایا ہے۔ اردو نظم اپنے ابتدائی زمانے سے اساطیری، تاریخی اور تہذیبی عوامل کو اپنے وجود میں سموتی آئی ہے۔ لیکن اس نے اپنے ابتدائی زمانے میں جگ بیتی کا روپ دھارے رکھا اور زندگی کے خارجی پہلوؤں کو موضوع بنایا۔ لفظ کے گرد مخصوص تصورات، احساسات کا حصار بنائے رکھا اور لفظ کی داخلی توانائی سے ناواقف بنی رہی۔ اردو نظم کا ابتدائی دور جاگیرداری تھا۔ اس دور میں عوام پر خواص کو فوقیت حاصل تھی۔ اس عہد میں دربار کو خاص اہمیت حاصل رہی۔ ابتدائی اردو نظم جاگیرداری نظام کی پروردہ ہونے کی وجہ سے محدود وسعتوں کی حامل ہے۔ تخلیق کار خواص کے نظریات کی عینک پہنے دور سے زندگی کا مطالعہ کرتے رہے۔ ان کے نزدیک فرد کی حیثیت خس و خاشاک سے زیادہ نہ تھی۔ موضوعات کے لحاظ سے اردو نظم کے ابتدائی دور کا اختتام ۱۸۵۷ء کے ہنگامے پر ہوتا ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد جاگیرداری نظام کی جگہ استعماری نظام نے لے لی۔ قدیم تہذیب کی بساط الٹ گئی اور زندگی کے تقاضے اور مسائل یکسر بدل گئے۔ قدیم علوم و فنون فرسودہ اور متروک ٹھہرے۔ اخلاقی اور مذہبی نظام تہہ بالا ہو گیا۔ ہر طرف انتشار اور بد نظمی پھیل گئی۔ اس صورت میں قدیم نظم زندگی کے اظہار کے لیے ناقص محسوس ہونے لگی۔ اس عہد میں نظم میں کئی جدتیں پیدا کی گئیں۔ ان جدتوں کے پیچھے دو نقطہ نظر کار فرما تھے۔ ایک نقطہ نظر تو وہ تھا جو تحریک علی گڑھ اور انجمن پنجاب کے مشاعروں سے پھوٹا تھا۔ اس نقطہ نظر نے نظم کو معاشرتی، سماجی، سیاسی اور مذہبی مقاصد کے لیے متعین کیا۔ سرسید اور ان کے رفقاء کا خیال تھا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے نتیجے میں جنم لینے والی زبانوں کی حالی کا واحد حل پیروی مغرب میں ہے۔ انھوں نے نظم کے ذریعے اپنے اس نقطہ نظر کو پروان چڑھایا۔ الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد اور اسماعیل میرٹھی کی نظم اسی نقطہ نظر کا شاخسانہ ہے۔ آزاد اور حالی نے اردو نظم کو نئے موضوعات سے متعارف کروانے کے ساتھ اردو نظم کے مروج ہیئت اور فکری سانچے میں کئی جدتیں پیدا کیں۔ اردو نظم نے حالی اور آزاد کے عہد میں ہندوستانی مظاہر فطرت کو اپنے دامن میں محفوظ کرنا شروع کر دیا۔ حالی اور آزاد سے قبل اردو نظم غیر مقامی تہذیبوں کی مختلف علامتوں کو بروئے کار لاتی تھی جو بنیادی طور پر اس کے مزاج سے میل نہیں کھاتی تھیں۔ آزاد اور حالی نے مغربی نظم کے تنوع میں اردو نظم کو نئے موضوعات سے مالا مال کیا اور اسماعیل میرٹھی اور عبدالحلیم شرر نے غیر مقفی نظم کی بنیاد ڈالی۔ جس نے آگے چل کر معری نظم کی صورت اختیار کر لی۔ ان موضوعاتی اور ہیئت تبدیلیوں کے باعث اس عہد کی نظم کو عموماً جدید نظم کہا جاتا ہے۔ اس بات میں کوئی شک

نہیں کہ اس عہد کے شعرا نے نظم کے مروج سانچوں سے کئی لحاظ سے انحراف کیا ہے لیکن اس عہد کی نظم نے بھی اپنے سے قبل نظم کی طرح خارجی پہلوؤں کو ہی موضوع بنایا ہے۔ ان دونوں عہدوں کی نظموں میں موضوعاتی بعد ہونے کے باوجود خارجی مماثلتیں موجود ہیں۔ اختر رشید امجد اپنے غیر مطبوعہ مقالے ”میراجی شخصیت اور فن“ میں لکھتے ہیں:

”حالی اور آزاد نے نظم کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے جن کوششوں کا آغاز کیا تھا وہ اس حوالے سے تو اہم تھیں کہ ان کے ذریعے نظم جدید تقاضوں کے قریب پہنچ گئی لیکن اس سے نظم میں کوئی نئی تبدیلی یا انقلاب نہیں آیا لیکن یہ ضرور ہوا کہ ہالرائیڈ، ڈاکٹر لائٹر اور اس طرح کے دوسرے پڑھے لکھے انگریزوں کی وجہ سے انگریزی ادبیات کے جو خیالات اردو میں فروغ پائے ان کی وجہ سے نظم ایک نیا راستہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئی۔“ (۱۰)

آزاد نے اردو کے شعر کو پیروی مغرب کی جانب گامزن کیا اور مغربی نظم کے تتبع میں ”نیچرل شاعری“ کی بنیاد ڈالی لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ آزاد سے قبل اردو نظم میں نیچر کو موضوع نہیں بنایا گیا۔ نظیر اکبر آبادی کی نظم نیچرل شاعری کی عمدہ مثال ہے لیکن اس کو اپنے تخلیقی عہد میں بوجہ پذیرائی نہ مل سکی۔ جوں ہی نیچرل شاعری کے لیے فضا سازگار ہوئی تو نظیر اکبر آبادی کی نظم کی افادیت واضح ہوتی گئی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد فروغ پانے والی اردو نظم کے پس منظر میں کار فرما دوسرا نقطہ نظر مغرب سے بیزاری کا ہے۔ اس نقطہ نظر کے حامل شعرا اہل مغرب سے نفرت کرتے تھے۔ ان کو اپنی قدیم تہذیب سے بے پناہ محبت تھی۔ اکبر الہ آبادی کی نظم مغربی تہذیب سے بیزاری کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے پیروی مغرب پر طنز و مزاح کے نشتر چلائے اور اردو نظم کو نئے الفاظ سے مالا مال کیا لیکن انھوں نے بھی زندگی کے خارج کو ہی موضوع بنایا۔ ان کی نظمیں بھی فرد کی داخلیت سے یکسر خالی ہیں۔ اقبال نے لفظ، تشبیہ، استعارے اور علامت کے گرد مخصوص معنوں کے حصار کو توڑا اور علامت اور استعارے کو نئے معنی اور مفاہیم سے وابستہ کیا۔ اقبال نے اردو نظم کو پہلی بار فرد کی داخلی زندگی سے متعارف کروایا۔ ڈاکٹر وزیر آغا اقبال کو جدید نظم کے علمبرداروں میں شمار کرتے ہیں۔ (۱۱)

اقبال نہ تو کلاسیکیت کی جکڑ بندیوں کو قبول کیا اور نہ ہی رومانویت کے انتشار کو اپنے قریب پھٹکنے دیا۔ اقبال کا فرد ماد پر آزادی کا حامل نہیں بلکہ انھوں نے اس پر کچھ روحانی پابندیوں کو لازمی قرار دیا ہے۔ ان کا فرد آزاد ہونے کے باوجود پایہ گل بھی ہے۔ اقبال نے اپنے ابتدائی دور میں ہندوستانی تہذیب کے عناصر اور مظاہر فطرت کو اپنی نظموں میں سمو دیا ہے۔ اقبال کی ابتدائی دور کی نظموں میں زمینی فضا کا لمس موجود ہے اور وہ ان نظموں میں ارضی وطن کے گن گاتے رہے ہیں لیکن مختلف تصورات کی یلغار نے ان کی نظم کو ملت کی طرف راغب کر دیا۔ اور اقبال اپنی نظموں میں اسلامی اساطیر علامتوں کو کثرت سے برتنے لگے۔

عقیل احمد صدیقی نے سرسید اور ان کی رفقا کی نیچرل شاعری کی تحریک سے ۱۹۳۵ء تک کے عرصے کو ”اردو نظم کا تشکیل دور“ کہا ہے۔ ۱۹۳۶ء کے آس پاس اردو نظم کا ایک نیا نقطہ نظر سامنے آیا۔ یہ نقطہ نظر ترقی پسند تحریک کا تھا۔ اس تحریک کے شعراء نے اردو

نظم کو ایک نئی جہت سے متعارف کروایا۔ انھوں نے اسلوب اور آہنگ کا نیا طریقہ اپنایا۔ ترقی پسند شعراء نے اقبال کے مخاطبانہ لہجے سے استفادہ کیا اور چیزوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں لفظ کو لغوی مفہوم میں استعمال کیا ہے اور بات کو ڈھکے چھپے انداز میں کرنے کی بجائے سادہ اور واضح انداز میں کیا ہے۔

قدیم اردو نظم اور جدید اردو نظم کے مباحث اردو نظم کے ابتدائی دور سے چلے آ رہے ہیں لیکن حلقہ ارباب ذوق اور ترقی پسند تحریک کے شعراء کے مباحث نے جدید اردو نظم کے افق کو روشن کیا۔ حلقہ ارباب ذوق کے شعراء نے اردو نظم کی داخلی جہت کو متعارف کروایا۔ انھوں نے فرد میں اتر کر اجتماعی لاشعور کے سمندر سے مقدس موتیوں کو نکال کر قاری کے سامنے انڈیل دیا۔

مجید امجد نے آفاقی اور عالمگیر مسائل کو موضوع بنانے کی بجائے مقامی مسائل کو ترجیح دی ہے۔ انھوں نے عصری مسائل کو کسی خاص مقصد یا آدرش کے تحت نہیں اپنایا بلکہ انھوں نے ان مسائل کے اظہار کے ذریعے اپنے انفرادی رد عمل کو نمایاں کیا ہے۔ ان کا نقطہ نظر اجتہادی ہے۔ وہ انسان اور کائنات کے درمیان ازلی رشتے کو دریافت کرتے ہیں۔ ان کا ذہن اسطور ساز فکر کا حامل تھا۔ ان کے نزدیک مظاہر فطرت اور دیگر اشیاء اپنی شخصیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے سماجی ناہمواریوں کو اساطیر کے ذریعے بیان کیا ہے۔ انھوں نے اساطیر کے برتاؤ میں جو جدت پیدا کی ہے وہ کسی اور شاعر کے ہاں نظر نہیں آتی۔

ن۔ م راشد کی ابتدائی نظموں پر فرائیڈ کے نظریہ جنس کے اثرات ہیں لیکن راشد نے جنس کو مستقل موضوع نہیں بنایا۔ انھوں نے فرد کی بازیافت ایرانی اور اسلامی اساطیر کے ذریعے کی ہے۔ راشد کی نظمیں ایک ایسے عالمی انسان کو پیش کرتی ہیں جو روحانی اور جسمانی دونوں طرح کی لذتوں کے حصول کے لیے کوشاں ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ راشد مغربی شاعری سے متاثر تھے لیکن انھوں نے اپنی نظموں کی بنیاد مشرقی تہذیبی عناصر پر رکھی ہے ان کے ہاں ہندی، ایرانی اور اسلامی اساطیر کے حوالے کثرت سے ملتے ہیں۔

میراجی نے بکھرتے ہوئے سماج کی تہذیبی اور ثقافتی قدروں کو منضبط کرنے کی کوشش کی ہے۔ انیسویں صدی کے عالمگیر ہنگاموں نے فرد کی شناخت اور اس کا اعتماد چھین لیا تھا۔ میراجی نے فرد کے وقار کو بحال کرنے کے لیے ہندی تہذیب اور اساطیر کا سہارا لیا ہے۔ میراجی کے ہاں اساطیر کی جنسی علامتیں کثرت سے ملتی ہیں کیونکہ ان کے نزدیک جنس تخلیقی عمل کی طرح مقدس فعل ہے۔ میراجی نے قدیم اساطیر سے استفادہ کرنے کے ساتھ کچھ اساطیر خود بھی تخلیق کیے لیکن ان کے اساطیر پیچیدہ نہیں ہیں۔

تصدیق حسین خالد کا شمار جدید نظم کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے دو عالمگیر جنگوں کے اثرات کے نتیجے میں بگڑتی ہوئی معاشی، معاشرتی، سماجی، سیاسی اور مذہبی صورت حال کے ساتھ فرد کی ذہنی کشمکش اس کی مٹی ہوئی پہچان اور انسانی قدروں کی شکست و ریخت کو تہذیبی، ثقافتی اور اساطیری حوالوں کے ذریعے بیان کیا ہے۔

تصدیق حسین خالد کی نظموں میں خوف اور تنہائی کی وہ گھمبیر صورت ملتی ہے جسے جدید معاشرے میں عالمگیر جنگوں نے پروان چڑھایا تھا، ان کی نظمیں اپنے تخلیقی عہد کے سیاسی اور سماجی تصورات کی عکاس ہیں۔ انھوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے اجتماعی لاشعور کی علامتوں، ہندی، مصری، ایرانی اور اسلامی اسطوری حوالوں سے استفادہ کیا ہے۔

ایم ڈی تاثیر نے بیسویں صدی کے تیزی سے بدلتے ہوئے تناظر کو بڑی ہنرمندی سے استعاروں اور علامتوں کے ذریعے بیان کیا ہے۔ ان کے اکثر موزوں علامت کے سوتے اساطیر سے پھوٹے ہیں۔ ان کا تخلیقی عمل اجتماعی لاشعور کے احساسی نقوش سے تشکیل پاتا ہے۔ ان کی نظموں پر ژونگ کے تصورات کے اثرات بہت واضح ہیں۔ فیض احمد فیض ایک ایسے نظام کی تشکیل کے خواہش مند تھے جس میں کسی قسم کا استحصال نہ ہو۔ انھوں نے دولت کی غیر مساویانہ تقسیم، معاشرتی بے چینی، بے روزگاری جیسے موضوعات کو استعاراتی اور اساطیر ی حوالوں کے ذریعے بیان کیا ہے۔ فیض احمد فیض کی علامتوں اور استعاروں میں اساطیری دنیا آباد ہے لیکن انھوں نے اساطیر کو اپنی نظموں میں کہانی کے طور پر نہیں بلکہ تلمیح کے انداز میں برتا ہے۔

یوسف ظفر زرنشت اور برگساں کے نظریات سے حد درجہ متاثر تھے۔ وہ مظاہر فطرت کو روح کا حامل تصور کرتے تھے۔ ان کے نزدیک مظاہر فطرت، حرکت، حرارت اور روشنی کے ماخذ ہیں جو روزا زل سے موجود ہیں۔ انھوں نے اردو نظم کو ایسے موضوعات اور رجحانات سے متعارف کروایا ہے جو زندگی کے ابتدائی زمانے کے رجحانات اور میلانات سے خاص مناسبت رکھتے تھے۔

قیوم نظر مظاہر فطرت کے مختلف پہلوؤں کی فلسفیانہ توضیح پیش کرتے ہیں۔ وہ خارجی موضوعات پر داخلی اور قلبی واردات کو فوقیت دیتے ہیں۔ بعض اوقات تو وہ اپنی ذات کو فطرت میں ضم کر کے داخل اور خارج کا حسین امتزاج تشکیل دیتے ہیں۔ ان کے ہاں تہذیبی اور اساطیری عناصر بھی ملتے ہیں۔

اختر الایمان کی نظموں کا بنیادی مرکز اور محور سماجی اور معاشرتی موضوعات ہیں۔ انھوں نے تہذیبی قدروں کی ٹوٹ پھوٹ اور شکست دریخت کو عہدگی سے بیان کیا ہے۔ وہ ماضی کے تجربات اور مشاہدات کو اپنی ذات کا حصہ تصور کرتے ہیں اور ان تجربات اور مشاہدات کے ذریعے اپنی ذات کو مرتب کرتے ہیں۔ اختر الایمان کی نظموں کا کمال یہ ہے کہ وہ نہ تو اظہار کے کسی تقلیدی راستے پر چلتی ہیں اور نہ ہی ذاتی اظہار کا ابہام بنتی ہیں۔

مختار صدیقی کا تخلیقی سفر فرد کے آشوب سے شروع ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ تہذیبی آشوب کی جانب بڑھتا ہے جس وجہ سے ان کے ہاں متنوع موضوعات ملتے ہیں۔ مختار صدیقی فلسفہ اور موسیقی میں گہری دلچسپی لیتے تھے انھوں نے موسیقی کی کیفیات اور اس کے راگوں کو جمالیاتی غنائی اور تہذیبی اور ثقافتی ورثے کو دریافت کیا ہے انھوں نے حال کو گرفت میں لینے کے لیے اساطیر کو استعمال کیا ہے جس سے فرد کا آشوب تہذیب کے گرد پھیلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کیفی اعظمی کے ہاں سفاک اور بے رحم زندگی کا سراغ ملتا ہے۔ ان کے پسندیدہ موضوعات میں مزدور اور متوسط طبقے کی محرومیاں، عورت کی مظلومیت، انسان کی تضحیک، سماجی نا انصافی، سیاسی بد عنوانی اور

جذباتی نا آسودگی وغیرہ شامل ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں میں سرمایہ دارانہ نظام سے بغاوت اور گہرے سماجی شعور کا اظہار اساطیری علامتوں کے ذریعے کیا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے میراجی کی طرح ارضی مظاہر، تہذیبی اور ثقافتی عناصر کو اپنی نظموں میں سموایا ہے۔ ان کا تخلیقی سفر معلوم سے نامعلوم کی جانب بڑھتا ہے۔ انھوں نے فرد کے داخلی اور ذاتی تجربے اور قدیم اجتماعی تجربے میں مماثلت دریافت کی ہے۔ ان کی ہاں فکر و وجدان کا ایک نیا جہان ملتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اپنی نظموں میں علامت سازی نہیں کرتے بلکہ علامتی اور اساطیری فضا تخلیق کرتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کے بقول:

"وزیر آغا کی خوبی یہ ہے کہ وہ تاریخ اور اساطیر کو بلا واسطہ طور پر استعمال میں نہیں لاتے بلکہ اس کے مواد تک رسائی حاصل کرتے ہیں جس سے اساطیر اور تلمیحات مرتب ہوتی رہتی ہیں" (۱۲)

عزیر حامد مدنی جدید عہد کے انسان کی ذہنی الجھنوں اور وسوسوں کے اظہار کے لیے اساطیری علامات کا سہارا لیتے ہیں۔ انھوں نے رموز و علامت کے ذریعے اپنی نظموں میں مفہیم کی پیچیدگیاں پیدا نہیں کیں بلکہ آسان اور سادہ انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی شعری زبان ماقبل شعری روایت سے جڑی رہتی ہے۔

منیر نیازی کی پہچان دیومالائی لحن ہے۔ انھوں نے جدید عہد کے انسانوں کے رویوں کا مطالعہ کیا ہے اور ان کی ذہنی الجھنوں کو اجتماعی لاشعور کی مثالوں، اساطیر اور روایات کے ذریعے بیان کیا ہے۔ ساجد علی نے اپنے غیر مطبوعہ مقالے ”اکیسویں صدی میں اردو نظم کا اساطیری مطالعہ“ میں لکھا ہے:

”منیر نیازی اپنے عہد کے فرد کی نفسی ذہنی کیفیت اور اس کے ذہن میں جنم لینے والے خلفشار، الجھنوں اور وسوسوں کو دیومالائی علامتوں کے ذریعے بیان کیا ہے۔ انھوں نے دیومالائی علامتوں کو اپنے تخلیقی تجربے کے ذریعے نئے معنی پہنانے کی کوشش کی اور افسانوی شعور کی کئی پر تیں کھولی ہیں“ (۱۳)

سلام مچھلی شہری نے اپنی نظموں میں اپنے عہد کے فرد کی سیاسی، سماجی اور ذہنی کشمکش کو موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے فرد کی نفسیاتی کیفیات کو بیان کرنے کے لیے اساطیر سے مدد لی ہے۔ ضیا جالندھری فرد کی داخلیت کو موضوع بناتے ہیں۔ لیکن وہ کسی طرح بھی فرد کے خارجی ماحول کو اس کی داخلیت کے پس منظر میں نمایاں کرتے ہیں۔ جس وجہ سے ان کی نظمیں اپنے تخلیقی عہد کے آشوب کی عکاسی کرتے ہوئے بہت سے قدرتی مناظر اور اساطیر کو اپنے وجود میں سمیٹ لیتی ہیں۔ عرش صدیقی کی نظموں کی پہچان ان کا افسانوی اور داستانوی اسلوب ہے۔ انھوں نے اردو نظم میں افسانوی تکنیک انٹی کلیمیکس کو متعارف کروایا ہے۔ ان سے قبل اردو نظم میں اس تکنیک کا رواج نہیں تھا۔ عرش صدیقی بظاہر تو لاشعور کا انکار کرتے ہیں لیکن لاشعوری جبلتیں پس پردہ ان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ اس حوالے سے ان کی نظم ”جادوگر“ کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ عمیق حنفی کی نظمیں جدید عہد میں فرد کی بنی بگڑتی شخصیت کے ادراک کو اجاگر کرتی ہیں۔ ان

کی نظمیں استعاراتی اور علامتی اسلوب کی حامل ہیں۔ شاذ تمکنت کی نظمیں روایتی اور جدید شاعری کے درمیان اظہار کی ایک نئی جہت تخلیق کرتی ہیں۔ شاذ تمکنت نے اپنی ذات کے تضاد اور انتشار کو اجتماعی لاشعور اور اساطیری علامتوں کے ذریعے واضح کیا ہے۔ کمار پاشی کے ہاں فرد کے ذاتی مسائل کی بجائے اجتماعی مسائل کا اظہار ملتا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں حیرت و استعجاب، وسوسوں، اندیشوں، خوابوں اور متھ کو نئے مفاہیم دینے کی سعی کی ہے۔ انھوں نے قدیم اساطیر سے استفادہ کرنے کے ساتھ نئے اساطیر تخلیق بھی کیے ہیں۔ وحید اختر کی نظموں میں عصری زندگی کے مسائل کا گہرا شعور ملتا ہے جو ان کی فلسفیانہ اور ناقدانہ سوچ کا عکاس ہے۔ ان کے ہاں خوابوں اور قدرت کے ٹوٹ جانے کا شدید احساس ہے۔ وہ فرد کے باطن میں اتر کر انسانی سرشت کو دریافت کرتے ہیں انھوں نے زندگی کی بدلتی ہوئی حالتوں کا مطالعہ گہری نظر سے کیا ہے اور وہ قدیم اور جدید فکر کو ہم آہنگ کرنے میں کافی کامیاب رہے ہیں۔

بیسویں صدی کی آخری تین دہائیاں ٹیکنالوجی کی ترقی اور عالمی قوتوں کی منصوبہ بندی کے حوالے سے بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان دہائیوں میں عالمی قوتوں نے ایک دوسرے کو شکست دینے کے لیے خود کو ٹیکنالوجی کے میدان میں مضبوط کیا ہے۔ اکیسویں صدی کے منظر نامے کو تشکیل دینے میں مادی اور سائنسی تصورات نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ایک طرف سائنسی ایجادات نے انسان کو خوشحال بنایا ہے اور دوسرے طرف اس کے ذہن میں اس کی ذات کے موہوم ہونے کا خدشہ پیدا کیا ہے۔ انسان زندگی کے ارتقائی سفر کے دوران کسی عہد میں بھی اتنا خائف نہیں رہا جتنا کہ اب ہے۔ مادی اور سائنسی ترقی نے سب سے زیادہ نقصان مذہب اور انسانی قدروں کو پہنچایا ہے۔ وہی انسان جو کبھی اشرف المخلوقات کے عہدے پر متمکن تھا اب اس کی حیثیت مشین کے پرزے سے زیادہ نہیں رہی۔ اکیسویں صدی کی صارفی اور میکاکی زندگی نے انسان سے اس کے خواب، امید اور یقین کو چھین لیا ہے جس کی وجہ سے اسے اپنی ذات بے سمتی، انتشار، لایعنیت اور بے یقینیت کے دائروں میں گھری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ موجودہ زندگی کی برق رفتاریوں نے انسان کو اپنے ماضی، تہذیب، ثقافت، مذہب اور روحانی قدروں سے عاری کر دیا ہے جس سے اس کی نفسیات اور رویوں میں ناقابل یقین تغیر آیا جسے بیان کرنے کے لیے نظم گو شعر نے اساطیر اور داستانوی کرداروں سے مدد لی ہے۔ اساطیری دیومالائی اور داستانوی کردار نسل انسانی کا تہذیبی اور ثقافتی ورثہ ہیں جو ہر انسان کے ذاتی لاشعور اور اجتماعی لاشعور میں محفوظ ہیں اور گاہے بگاہے اس کے شعور پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔

اکیسویں صدی کے شعر نے زندگی کے بدلتے ہوئے تناظر معاشرتی ٹوٹ پھوٹ، بے یقینی کی صورت حال، انسانی نفسیات اور رویوں کو دیومالائی اور داستانوی کرداروں کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ٹمس الرحمن فاروقی کی نظم متعدد ذراویوں سے زندگی کا مطالعہ کرتی ہے اور مرکزی موضوع کو وسعت اور گہرائی دینے کے ساتھ اسے متنوع مفاہیم سے ہم کنار بھی کرتی ہے۔ دراصل ٹمس الرحمن فاروقی نے داخلیت کی دھیمی، پرسوز، پکدار اور موسیقی آمیز آواز کو پروان چڑھایا ہے جس کی ترسیل کی ابتدائی کوشش میراجی نے کی تھی۔ ٹمس الرحمن فاروقی کا مغربی ادب پر مطالعہ بہت وسیع ہے۔ لیکن ان کا مزاج مشرقی اور ان کی سوچ مابعد الطبعیاتی ہے۔ مشرقی خیال و فکر نے ان کے وجدان کو آسمانی رفعتوں سے ہم کنار کیا ہے۔ چونکہ ان کا داستانوی اور اساطیری کرداروں کا درآنا فطری بات ہے۔

شہریار غیر معمولی قوت احساس اور فکر کے مالک تھے۔ انھوں نے کائنات کا تجزیاتی مطالعہ کیا تھا۔ انھوں نے اپنی شاعری میں انسان اور کائنات کے درمیان بننے اور ٹوٹنے روابط کو اساطیری علامتوں کے ذریعے بیان کیا ہے۔ ان کے ہاں تہہ دار اسلوب ملتا ہے لیکن ان کو فن پر مہارت تھی جس وجہ سے ان کے کلام میں کسی قسم کا ابہام پیدا نہیں ہوا۔

شاہد شیدائی کی نظمیں ادراک اور احساس کی اس سطح کی غماز ہیں جہاں پر انسان کو اپنی ذات، زندگی اور کائنات کے اسراروں سے معرفت حاصل ہوتی ہے۔ انھوں نے ہندی اساطیر علامتوں کے زوال کے ذریعے تہذیبی زوال کو جاگر کیا ہے۔ بسا اوقات شاہد شیدائی عالمگیر اور آفاقی علامتوں کو مقامی سطح پر جوڑ کر مقامی مسائل کے بیان میں آفاقت پیدا کرتے ہیں۔ ان کے ہاں قرآنی اساطیری علامتیں اور تعلیمات بھی ملتی ہیں۔

کشور ناہید نے نسوانی طبقے کے خیالات اور جذبات کے اظہار کے لیے اپنی نظموں میں اساطیری علامتوں کو برتا ہے۔ ان کی نظمیں تانثیت کی عالمی تحریک سے بے حد متاثر ہیں لیکن انھوں نے تانثیت مقاصد کے ابلاغ کی خاطر شعری جمالیات کو نظر انداز نہیں کیا۔ کشور ناہید نے محض نسوانی طبقے کی محرومیوں کو نہیں بیان کیا بلکہ مردوں کے مساوی حقوق کا مطالبہ بھی کیا ہے۔

افضال احمد خوابوں کے چھن جانے کو تہذیب اور تاریخ کے چھن جانے کے مماثل سمجھتے ہیں۔ ان کی نظمیں مادی اور صارفی تصورات کے زیر اثر پینے والی سوچ اور فرد کے چھن جانے والے خوابوں کے ایسے کو پیش کرتی ہیں۔ افضال احمد عصری مسائل کو تہذیبی اور تاریخی تناظر میں دیکھتے ہیں جس وجہ سے ان کی نظموں میں تہ دار معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔

فہیدہ ریاض فکری طور پر مارکسیت اور تانثیت کی تحریکوں سے متاثر تھیں۔ انھوں نے اپنے سماج کے مسائل کو عالمی مسائل کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ ان کے ہاں عورت مظلومیت کا استعارہ بن کر ابھرتی ہے جو استحصال زدہ طبقے کی نمائندگی کرتی ہے۔ ان کی نظموں میں عورت کا آرکی ٹائپل تشخص ملتا ہے۔ انھوں نے انسان زندگی کے رشتوں اور قدروں کا تقابل کاروباری رشتوں اور قدروں سے کر کے نئی زندگی کے نئے رشتے دریافت کیے ہیں۔ فہیدہ ریاض نے پرکھوں کی روایات، اساطیر اور مظاہر فطرت کو اپنی نظموں میں محفوظ کیا ہے۔ نصیر احمد ناصر کی نظمیں صارفی جبر سے فرد کے ذہن میں پیدا ہونے والے خدشوں، الجھنوں اور وسوسوں کو پیش کرتی ہیں انھوں نے اساطیری عناصر کے ذریعے سیاسی اور سماجی مسائل، تاریخی جبر اور سائنسی انکشافات کا اظہار کیا ہے۔ نصیر احمد ناصر نے نازک عصری مسائل کے ساتھ فرد کے لاشعوری اور داخلی مسائل کو بھی موضوع بنایا ہے۔

شاہین مفتی کی نظموں پر وجودی فکر کے اثرات غالب ہیں۔ ان کی نظموں میں منفی، اور انتہائی پسند روئے اور رجحانات نہیں ملتے بلکہ انھوں نے مثبت اور معتدل رویوں کو پروان چڑھایا ہے۔ انھوں نے مشرقی عورت کی محبوبیوں، محرومیوں اور اس پر سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور سماجی نظاموں کے ذریعے لگائی جانے والی مختلف پابندیوں کو اساطیری علامتوں کے ذریعے بیان کیا ہے۔

علی محمد فرشی نے فلسفیانہ سوچ اور تخلیقی عمل کے ذریعے اپنی نظموں میں اساطیر تخلیق کیے ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ معمولی اور مقامی کرداروں کو ماورائیت کے پیکر میں پیش کرتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کی نظم علیہ دیکھی جاسکتی ہے۔ علی محمد فرشی کا شعری تجربہ حسی، فکری اساطیری، مذہبی اور تاریخی عناصر کے امتزاج سے تشکیل پاتا ہے۔ اقتدار جاوید کائناتی وسعتوں کو چھونے کے لیے جو دائرے تشکیل دیتے ہیں۔ ان دائروں کے اکثر نقطے اساطیری حوالوں پر مشتمل ہیں۔ جو ان کی نظم کے کینوس کو وسیع کرتے ہیں۔ بعض اوقات اقتدار جاوید مقامی علامتوں کی جڑت اساطیر اور دیومالا سے اس انداز سے کرتے ہیں کہ وہ آفاقیت کی حامل بن جاتی ہیں۔ دیومالائی علامتوں کے ذریعے حال کو ماضی سے منسلک کرنے کا فن اقتدار جاوید کو خوب آتا ہے۔ وہ اپنے اس فن کے ذریعے اپنی ذات کی پہچان قائم کرتے ہیں۔

رفیق سندیلوی کی نظمیں داستانوں کی طرح مافوق الفطرت ماحول کی حامل ہیں۔ رفیق سندیلوی اپنی نظموں میں داستان گو کی طرح حیرت، تجسس اور طلسماتی کیفیات کو ٹوٹے نہیں دیتے۔ ان کی نظموں میں ہیر وازم کار جہان ملتا ہے۔ جو ان کے کسی ہم عصر شاعر کے ہاں نہیں ملتا۔ ذیشان ساحل کو فطرت دشمن عناصر اور رویوں سے سخت نفرت تھی۔ انھوں نے اپنی نظموں میں مظاہر فطرت کے مرقع پیش کرنے کے ساتھ اکیسویں صدی میں سماج کی بگڑتی ہوئی صورت کو اساطیر کے ذریعے موضوع بنایا ہے۔

معین نظامی کے نزدیک انسان کی شناخت اپنی دھرتی، تہذیب ثقافت، اساطیر اور تاریخ سے ہے۔ اس لیے وہ اکیسویں صدی کے معاشرتی مسائل کو تہذیبی اور تاریخ تناظر میں دیکھتے ہیں۔ وہ معاشرتی جبر کو تاریخ کا تسلسل تصور کرتے ہیں اور اسے اساطیر علامتوں کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔ ارشد معراج کے پسندیدہ موضوع اساطیر، تاریخ اور موسیقی ہیں۔ ان کی نظمیں جدید عہد کے فرد کا المیہ بیان کرتی ہیں۔ انھوں نے شعور اور لاشعور کے امتزاج سے نظمیں تخلیق کی ہیں۔ اس وجہ سے ان کی نظموں میں اساطیری فضا قائم ہو گئی ہے۔

روش ندیم کی نظموں کے اکثر کردار مختلف طبقتوں اور قوتوں کے نمائندہ ہیں۔ انھوں نے یہ کردار اساطیر اور مذہبی تمثیلوں کے ذریعے تخلیق کیے ہیں۔ ان کی نظمیں عصری عہد کے تلخ حقائق کو موضوع بناتی ہیں۔ عامر عبد اللہ کی نظموں کا مرکز اور محور وقت ہے جو ایک تجریدی ہیولے کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ ان کے ہاں وقت ایک حیاتیاتی کل کی مانند ہے جس سے ان کی نظموں کے اکثر موضوعات پھوٹتے ہیں۔ اکیسویں صدی میں مادی ترقی اور سائنسی ایجادات نے انسان کو ان گنت سایوں میں تحلیل کیا ہے۔ جس کا اظہار عامر عبد اللہ کے ہاں ملتا ہے۔

علی اکبر ناطق مابعد الطبیعیاتی عناصر میں بے حد دلچسپی لیتے ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں میں مابعد الطبیعیاتی عناصر کو بڑی عمدگی سے زمانہ حال کے ساتھ پیوست کیا ہے۔ نارسائیت اکیسویں صدی کے فرد کا اہم مسئلہ ہے جسے دانیال طریر نے اپنی نظموں میں بڑی ہنرمندی سے بیان کیا ہے۔ وہ فرد کے وجود کا یقین النفس اور آفاق کاکلیت کے پس منظر میں کرتے ہیں۔ دانیال طریر موجودہ دور کی پیچیدہ اور مشکل سچائیوں کو منظر عام پر لاتے ہیں۔ اس جستجو کے دوران انھیں جو دشواریاں پیش آتی ہیں۔ وہ فکری اور وجودی سطح کو پیچیدہ بنادیتی

ہیں۔ وہ عصری عہد کے مسائل کی گھمبیر تاؤں کی معروضی صورت حال کو دیگر نظم گو شعرا کی طرح نظر انداز نہیں کرتے۔ ان کی اکثر نظمیں معنویت اور بے معنویت موجود اور ناموجود کی آویزش کو اساطیری علامتوں کے ذریعے بیان کرتی ہیں۔

موضوع کے لحاظ سے دیکھا جائے تو محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی کے عہد میں جدید نظم کا آغاز ہوتا ہے لیکن اس عہد کی نظم کی ہیئت میں کوئی قابل قدر تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ اکثر ناقدین اس بات پر متفق ہیں کہ جدید نظم وہ نظم ہے جس نے مروجہ موضوع اور ہیئت دونوں سے انحراف کیا ہو۔ ایسی نظم سب سے پہلے ن۔ م۔ راشد، میراجی اور تصدق حسین خالد کے ہاں ملتی ہے۔ اسی وجہ سے راقم نے اس مطالعہ میں ن۔ م۔ راشد، میراجی اور تصدق حسین خالد کے عہد میں فروغ پانے والی نظم کو ترجیح دی ہے۔ اس نظم کی طرف راشد، میراجی اور تصدق حسین خالد کے ہم عصر شعرا نے اس قدر توجہ نہیں دی جس طرح اکیسویں صدی کے شعرا نے دی ہے۔ اگر اصولی طور پر دیکھا جائے تو راشد اور میراجی کو اکیسویں صدی میں جانشین ملے ہیں۔ جنہوں نے ان کے اجتہادی رجحان کو فروغ دیا ہے۔ اکیسویں صدی کے شعرا نے آگ اور خون کے منظر نامے، مادی ترقی اور صارفیت کے زیر اثر بگڑتی ہوئی انسانی قدروں، منافقانہ رویوں، ہم ذات کی جدائی کے دکھ، سائنس اور ٹیکنالوجی کے بدولت معدوم ہوتی ہستی کو اساطیری علامتوں اور مذہبی تمثیلوں کے ذریعے بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے۔

حوالہ جات

- ۱۔ عبدالحق، مہر، ڈاکٹر، ہندو صنمیت (مقدمہ) (ملتان: بیکن بکس، ۱۹۹۳ء) ص ۱
- ۲۔ سبط حسن، ماضی کے مزار (کراچی: دانیال، ۱۹۸۷ء) ص ۳۰۳
- ۳۔ سید اعجاز، ڈاکٹر (مترجم)، شاخ زریں (جیمز فریزر) (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۵ء)، ص ۱۱۳
4. Comte Fernand " A Dictionary of Mythology (Wordsworth Collection), London, 1947, P16-17
- ۵۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو کا افسانوی ادب (ملتان: بیکن بکس، ۱۹۸۸ء) ص ۶۴
- ۶۔ انعم نواز، انتظار حسین کے افسانوں میں اساطیری اور تمثیلاتی عناصر، (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۲۰ء) ص ۵۹
- ۷۔ سید یاسر جواد، انسائیکلو پیڈیا ادبیات عالم (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۳ء)، ص ۳۸۸
- ۸۔ ساجد علی، اکیسویں صدی میں اردو نظم کا اساطیری مطالعہ، مملوکہ لاہور یونیورسٹی لائبریری، ۲۰۲۰ء، ص ۷۲
- ۹۔ شکیل الرحمن، ڈاکٹر محولہ اے مالوی ڈاکٹر، ویدک ادب اور اردو (انڈیا: سروج شکر پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء) ص ۳۴
- ۱۰۔ اختر رشید امجد، میراجی شخصیت اور فن مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، ۱۹۹۰ء ص ۲۱۳، ۲۱۴

- ۱۱۔ وزیر آغا، ڈاکٹر۔ اردو شاعری کا مزاج (نئی دہلی، ۱۹۹۱ء)، ص ۳۳۹
- ۱۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، ڈاکٹر وزیر آغا ایک مطالعہ (کراچی: مکتبہ اسلوب، ۱۹۸۳ء)، ص ۶۲
- ۱۳۔ ساجد علی، اکیسویں صدی میں اردو نظم کا اساطیری مطالعہ، ص ۱۹۳